ڈاکٹر محمد منصور عالم، کولکاتا

انیسویں صدی کے بنگال کا باکمال فارسی شاعر
سید محمود آزاد

فارسی زبان وادب کی شجر کاری ہندوستان میں انتہائی کامیاب ثابت ہوئی۔ اس میں ایسے پھول اور شگوفے کھلے کہ انھیں ایران میں مہکنے والے گل ولالہ کے برابر رکھنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ مگر موسم اور حالات کی تبدیلی نے اس کی نشوونما کے تمام مواقع ختم کردیئے۔ حکومت برطانیہ کی جانب سے ۱۸۳۷ء میں جاری کردہ لسانی ایکٹ نے اس کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کردی۔

فارسی زبان کی قلم کاری سے پیدا ہونے والی اردو زبان اب پل کر جوان ہوچکی تھی۔ انیسویں صدی کے وسط تک اس کی گھن گرج پورے ہندوستان میں سنی جارہی تھی۔ اردو زبان میں شعر کہنے والے شعراء کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ مگر وہ بذات خود فارسی زبان کے مقابلے میں اردو شاعری کو کوئی مقام دیتے ہوئے جھجک محسوس کرتے تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء) نے اردو زبان میں انتہائی بلند پایہ اشعار کہے مگر فارسی شاعری کے مقابلے میں وہ اسے ریختہ کہہ کرٹالتے رہے۔

اس زمانے کے ایک اور مشہور شاعر نواب سید محمود آزادؔ (۱۸۴۲ء۔۱۹۰۷ء) کی ادبی مجلسیں ڈھاکہ میں روشن ہوتی رہیں۔ مرزا غالبؔ کی طرح انھوں نے بھی فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں اشعار کہے، مگر ان کی اردو شاعری محض منہ کا ذائقہ بدلنے کی کوشش

ہے۔ اس لئے کہ دیوان میں جہاں ان کے فارسی اشعار کی تعداد ۱۴۴۳ ہے، وہاں اردو اشعار صرف ۱۶۱ ہیں۔

مرزا غالب کی طرح محمود آزاد کو بھی اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا، کہتے ہیں:

آزاد نظم ریختہ کچھ میرا فن نہیں

واقف ہیں فارسی کے میرے شعر تر سے آپ

مولوی رحمٰن علی طیش، مصنف ''تواریخ ڈھاکہ'' اپنی کتاب میں محمود آزاد کے متعلق لکھتے ہیں:

''مولوی سید محمود عرف منجھلے سید صاحب خلف سید اسد الدین حیدر ابن سید علی مہدی خان بہادر خلف میر اشرف علی رئیس ڈھاکہ' آپ کے اشعار گہربار متانت و فصاحت و بلاغت سے مملو ہیں۔ آپ صاحب دیوان ہیں اور علاوہ دیوان کے بہت سا کلام آپ کے شاگرد رشید خواجہ محمد افضل صاحب کے پاس موجود ہے۔ جن میں سے بطور مشتے از خروارے ہدیہ ناظرین ہے۔ آپ ارشد تلامذہ حافظ ضیغم صاحب ہیں۔ آپ کے فارسی قصائد سمجھنے کے لئے معمولی استعداد کافی نہیں ہے۔ آپ کو بیحد شوق کتب بینی تھا چنانچہ انتقال کے کچھ پیشتر آپ باحواس تھے، اساتذہ کے دواوین مدنظر رہا کرتے تھے اور قیلولہ کے بعد برابر آپ مطالعہ فرماتے تھے۔ ایک لاکھ چیدہ اشعار از بر تھے۔ (العہدہ علی الراوی) بقول خواجہ محمد افضل ایک مرتبہ دو روز میں پانچ ہزار اشعار سنائے تھے۔ آپ نے فالج سے قریب ۶۵ سال کی عمر میں ۱۹۰۷ء میں رحلت فرمائی۔ اوائل میں اپنا تخلص شیدا کیا کرتے تھے۔ آپ کی مثنوی ذوبحرین بمدح سر عبد الغنی مرحوم قابل دید ہے۔ آپ نے واقعہ ڈھاکہ ٹورینڈو نظم کیا۔''

حکیم حبیب الرحمٰن اپنی کتاب ''ثلاثہ غسالہ'' میں آزاد سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

''سخنور یگانہ فخر زمانہ فارسی میں اہل زبان رشک کرتے اور معلوم ہو کہ مومن کے رنگ میں ان سے بہتر کہنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا۔ سید اسد الدین حیدر کے صاحبزادے اور مشہور

رئیس ڈھاکہ میر اشرف علی کے پوتے تھے۔ آغا احمد علی مرحوم ان کے استاد تھے۔ جو کچھ حاصل کیا انہیں سے حاصل کیا۔ شاعری کا شوق ابتدائے عمر سے تھا۔ پہلے شیدا تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ موید برہان میں جو تقریظ ہے، وہ اسی نام سے چھپی ہے۔ اردو میں بہت کم کہتے تھے مگر جب کہتے تھے تو مومن کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔ ذی اخلاق، مہذب اور پابند وضع بزرگ تھے۔ کم سنوں کی حوصلہ افزائی ان پر ختم ہوتی تھی۔ زندگی بھر سہ پہر کو دولت کدے پر ایک مختصر سا مجمع شائقین شعر وسخن رہتا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں انتقال فرمایا۔ لنگر خانہ کی مسجد کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ ان کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ دیوان آزاد کے نام سے محفوظ ہے۔ آزاد ۱۸۴۲ء کے اواخر یا ۱۸۴۳ء کے شروع میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں آغا علی احمد سے پھر عبدالغفور نساخ کی وساطت سے ضیغم سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ جب غالب کلکتہ آئے تو آزاد وہیں تھے۔ مرزا سے ملاقات کیا ہوئی کہ زندگی بھر انہیں کے ہوکر رہ گئے۔"

آزاد کے ہم عصر اور اپنے زمانے کی مقتدر ادبی شخصیت رضا علی وحشت (۱۸۸۱ء-۱۹۵۶ء) نے بھی فارسی شاعری سے ان کی گہری وابستگی کا ذکر کیا ہے۔ ہندستان اور ایران میں فارسی کو شعراء کے ایک تذکرہ نگار لطیف الرحمٰن نے اپنی کتاب "تجلیات شعرستان فارسی" میں محمود آزاد کی حالات زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق محمود آزاد کے پردادا، امیر اشرف علی اصفہان سے ترک وطن کرکے ہندستان آئے اور موجودہ بنگلہ دیش کی راجدھانی ڈھاکہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ اپنی شرافت، ذہانت اور فیاضی کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد مقامی لوگوں کے دل جیت لیے اور شہر کے معزز اور مقتدر امراء میں شمار کیے جانے لگے۔ ان کے بڑے صاحبزادے میر مہدی علی، محمود آزاد کے دادا تھے۔ والد کا نام سید اسد الدین حیدر تھا۔ سید محمد آزاد، جن کے مضامین 'اودھ پنچ' میں شائع ہوتے تھے' ان کے برادر حقیقی تھے۔ سید محمود آزاد ۱۸۴۲ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ گھرانہ بہت متمول اور خوشحال تھا۔ اس لئے ان کی پرورش وپرداخت نازونعم میں ہونے لگی۔ لہذا ابتدائی زندگی شاہانہ

گزری۔ مگر دھیرے دھیرے خاندانی جائیداد ختم ہونے لگی۔ مناسب ذریعہ آمدنی نہ ہونے کے سبب وہ ملازمت کی تلاش میں اپنے بھائی محمد آزاد کے ہمراہ کلکتہ چلے آئے اس وقت سید نواب عبداللطیف خان بہادر (۱۸۲۸ء-۱۸۹۳ء) کلکتے میں انتہائی بااثر شخصیتوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ برطانوی حکومت میں انھیں کافی اثر ورسوخ حاصل تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں انھوں نے دونوں بھائیوں کو انٹرویو میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا۔ وقت مقررہ پر وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں کوئی انگریز افسر اس کام کے لئے تعینات تھا۔ مگر امیدواروں کی لمبی قطار دیکھ کر محمود آزاد پریشان ہوگئے اور اپنی باری آنے سے قبل ہی چلے آئے۔ جبکہ ان کے بھائی محمد آزاد بیٹھے رہے۔ انھوں نے تشفی بخش انٹرویو دیا اور ان کی تقرری ہوگئی۔ وہ اسپیشل سب رجسٹرار بنادیے گئے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ صوبۂ بنگال اور بہار کے شعبہ رجسٹریشن کے انسپکٹر جنرل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

سید محمد آزاد ایک الگ طبیعت کے انسان تھے۔ انھوں نے سرکاری ملازمت کرنا کسی صورت میں گوارانہ کیا۔ آخرکار وہ ڈھاکہ لوٹ گئے۔ یہاں گزر بسر کا کوئی مناسب ذریعہ نہ تھا۔ بقیہ زندگی انھوں نے شدید عسرت اور غربت میں گزاری۔ ۱۹۰۷ء میں ڈھاکہ میں ان کا انتقال ہوا۔ اور شہر کی لنگر خانہ مسجد سے متصل قبرستان میں دفن کیے گئے۔

محمود آزاد نے اپنے دیوان کے دیباچے میں اپنے حالات زندگی سے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے، تاہم ان کے اشعار میں تنگ دستی اور پریشان حالی کا نوحہ ضرور ہے۔ قسمت آزمائی کے لئے انھوں نے سفر کلکتہ کا ذکر ضرور کیا ہے۔ سفر کلکتہ سے متعلق ایک قصیدہ تمام تفصیلات فراہم کرتا ہے۔ اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ موسم سرما میں انھوں نے سمندر کے راستے ڈھاکہ سے کلکتہ تک کا سفر کیا۔ ایک تو تکلیف دہ موسم، دوسرے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑنے کا غم انھیں راستے بھر پریشان کرتا رہا۔ بڑے ہی دل سوز انداز میں وہ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں:

زنگل زمین وطن در چنین زمان کہ کسی
نمی کند حرکت از مقر خود بہ جہان
بہ سیلی ستم دھر و گردشِ تقدیر
روان بہ جانب کلکتہ ام بہ صد حرمان
میان کشتی چرخ نشستہ ام مغموم
جگر گداختہ از رنجِ دوری یاران

محمود آزاد کو تاریخ گوئی میں بڑی مہارت حاصل تھی ۔ مگر اس قصیدے میں ایسا کوئی شعر موجود نہیں جس سے ان کی کلکتہ آمد کی تاریخ کا پتہ چلے۔ کلکتہ میں ان کے قیام کی مدت اور سرگرمیوں کی کوئی تفصیل موجود نہیں ۔ ان کے ایک ہم عصر رضا علی وحشت نے ان کا تذکرہ اس انداز سے کیا ہے۔

''مجھے کلکتہ میں ایک مرتبہ سید محمود آزاد سے ملنے کا اتفاق ہوا، اس وقت میری نوجوانی کا زمانہ تھا ۔لیکن وہ ضعیف العمری کو پہنچ چکے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی بھنویں سفید ہوچکی تھیں۔ شہر کے ایک مشہور شاعر' قاضی عبد الحمید کے مکان میں تشریف فرما تھے۔ قصائد عرفی کی شعری خوبیوں کا تذکرہ تھا۔ وہ گاہے گاہے اس کے بند گنگناتے اور جھومتے جاتے تھے۔''

بنگال کے چند تذکرہ نگاروں نے سید محمود آزاد کے قیام کلکتہ کے بارے میں چند ایسی باتیں تحریر کی ہیں جن کا حقائق سے دور کا بھی رشتہ نظر نہیں آتا۔ ایسے لوگوں میں ''تجلیات شعرستان فارسی'' کے مصنف لطیف الرحمٰن بھی شامل ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مرزا غالب جن دنوں اپنے پنشن کے سلسلے میں کلکتہ وارد ہوئے' سید محمود آزاد بھی یہاں موجود تھے ۔ دونوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی ۔لگتا ہے سید صاحب کو حکیم حبیب الرحمٰن کے اس جملے سے دھوکہ ہوا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''جب غالب کلکتہ آئے تو آزاد یہیں

تھے۔ مرزا صاحب سے ملاقات کیا ہوئی کہ زندگی بھر انہیں کے ہو کر رہ گئے'' یہی نہیں بلکہ انہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ سید محمود آزاد مرزا غالبؔ سے مل کر اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے خود کو مرزا کا شاگرد کہلانا باعث فخر محسوس کیا۔ بلکہ تعلقات کے رشتے کچھ ایسے مستحکم ہوئے کی مرزا کی دہلی واپسی کے بعد بذریعہ خط وکتابت اصلاح شعروسخن کا سلسلہ جاری رہا۔ مرزا کی صحبت سے استفادہ کی غرض سے محمود آزاد ہر سال دہلی جاتے رہے اور کم از کم تین ماہ تک قیام پذیر ہوا کرتے۔ یہ تحقیق کی زبردست غلطی ہے۔

مرزا غالبؔ کی کلکتہ آمد اور یہاں سے واپسی کی تاریخ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ تاریخی اعتبار سے دونوں کی ملاقات کوئی حقیقت نہیں رکھتی اس لئے کہ محمود آزاد اس وقت تک دنیائے فانی میں تشریف نہیں لائے تھے۔ ان کی پیدائش غالبؔ کے کلکتے سے ۲۹ / نومبر ۱۸۲۹ء کو چلے جانے کے ۱۲ / سال کے بعد ہوئی۔ غالبؔ اور آزاد کے درمیان استاد شاگرد کا رشتہ بھی بے معنی سی بات ہے۔ اگر اس طرح کوئی بات ہوتی تو محمود آزاد کے دیوان میں اس کے اشارے ضرور موجود ہوتے۔

محمود آزاد نے اپنے استادوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اصلاح شعروسخن میں آغا احمد علی احمد اور حفیظ اکرام الدین احمد ضیغم کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ مگر مرزا غالب کے سلسلے میں انھوں نے کوئی بات نہیں کہی ہے البتہ محمود آزاد کے دیوان میں ایک شعر موجود ہے جس میں سرسری طور پر غالبؔ کا نام آجاتا ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غالبؔ سے ان کو شرف تلمذ حاصل تھا۔

مرزا غالب کے انتقال کے وقت محمود آزاد کی عمر تقریباً ۲۷ / سال تھی۔ ان کے دیوان میں مدحیہ انداز میں متعدد قطعہ تاریخ موجود ہیں جو انھوں نے اپنے سرپرستوں کے علاوہ دوست احباب کی موت پر کہے تھے۔ مگر غالبؔ کی موت سے متعلق کوئی قطعہ تاریخ موجود نہیں۔ یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ آزاد کو غالب سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔

محمود آزاد کے غالب کا مداح ہونے کا کوئی سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ شعر وسخن کی دنیا میں انکی رہنمائی کرنے والی مقتدر شخصیت آغا احمد علی بذات خود مرزا کے کٹر مخالف تھے۔ مالک رام نے بھی اپنی تصنیف ''تلامذۂ غالب'' میں محمود آزاد کو مرزا کا شاگرد تسلیم نہیں کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود کلکتہ کے ایک نقاد شانتی رنجن بھٹا چاریہ کو اصرار ہے کہ مرزا غالب اور محمود آزاد کی ملاقات ہوئی تھی اور دونوں کے درمیان استاد اور شاگرد کا رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ حالانکہ مرزا نے اپنے دور دراز کے شاگردوں کو بے شمار خطوط لکھے ہیں۔ ایسی صورت میں محمود آزاد کے نام بھی کوئی خط ضرور موجود ہوتا۔ پتہ نہیں شانتی رنجن بھٹا چاریہ جیسے سلجھے ہوئے محقق سے کیسے سہو ہوگیا۔

محمود آزاد کی مطبوعہ تصنیف میں صرف ان کا دیوان ہم تک پہنچا ہے جو ان کی زندگی ہی میں ۱۳۰۷ھ یا ۱۸۹۴ء میں عظیم آباد سے شائع ہوا تھا۔ دیوان میں اس زمانے کی ایک مشہور ادبی شخصیت عبد الغفور شہباز کا دیباچہ موجود ہے جس میں انتہائی بلند وبانگ انداز میں تعریف کے پل باندھے گئے ہیں۔ دیباچے میں شاعر یا ادیب کی بے جا مدح سرائی ایک روایت سی بن گئی تھی۔ خامیوں پر کم اور خوبیوں پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ دیوان محمود آزاد کا دیباچہ بھی اسی روایت کا شکار ہے۔ تنقیدی اعتبار سے اس دیباچے کی کوئی اہمیت نہیں۔

محمود آزاد کا دیوان دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول فارسی کے لئے مخصوص ہے اور دوسرے میں کلام ریختہ کے عنوان سے اردو میں کہی گئی تیرہ غزلیں اور پانچ رباعیاں ہیں۔ فارسی کلام کے ذخیرے میں نو قصیدے، تیرہ غزلیں، تین مثنویاں، بائیس رباعیاں اور سولہ قطعات تاریخ موجود ہیں۔ دیوان کے اخیر میں مسدس آزاد کے عنوان سے ایک مسدس کو شامل کرلیا گیا ہے جس میں اکتیس بند ہیں۔

محمود آزاد نے تقریباً سبھی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے مگر ان کا خاص میدان قصیدہ ہے۔ ان کے دیوان کا تقریباً نصف حصہ قصائد سے بھرا پڑا ہے۔ قصیدے کی ابتداء

انھوں نے حمد اور نعت سے کی ہے۔ اس کے بعد مختلف شخصیتوں کی شان میں قصائد تحریر کیے ہیں۔ ان شخصیتوں میں چند نواب صاحبان بھی شامل ہیں جنھیں آزاد کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے۔ مثلاً خواجہ عبد الغنی احسان اللہ خان بہادر اور کلب علی خان بہادر وغیرہ۔ مشہور شاعر عبد الغفور نساخ کی شان میں بھی ایک قصیدہ موجود ہے۔ آزاد نے ''معراج الخیال'' کے عنوان سے فارسی زبان کے مشہور قصیدہ گو خاقانی کے ایک مشہور قصیدہ:

دل من پیر تعلیم ست ومن طفل زبان دانش
دم تسلیم سر عشر وسر زانو دبستانش

کے انداز میں مدحت رسول پیش کی ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

دلم گلچین اسرار وخیال من گلستانش
فضای هر دوعالم گوشه ای از یک خیابانش
خوشا باغی که طبعش باغبان فکر ش صبا آمد
قلم گلدسته بند وصفحه قرطاس گلدانش
خوشا باغی که رشک خلد شد دامان آگاهی
زرنگین جلوه های دلکش گلهای الوانش
تعالیٰ الله چه باغیست این که ریزد گوهر مضمون
حبیب گوش عقل آواز مرغان خوش الحانش
تعالیٰ الله چه باغیست این که میخواران معنی را
... مستی جاوید آمد بوی ریحانش
زهی باغی که مانند تاقیامت تازه گلهایش
نه آن باغی که ره نبود در او باد خزانی را
چه در اردی چه در بهمن نه بینی تازه یکسانش
زهی باغی که نازک نکته ٔ هوش وخرد افزا

فزون از حصر منقوش است بر اوراق واعضا یش

اس قصیدے کے ایک حصے میں انھوں نے شہر ڈھاکہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ڈھاکہ کی خوب صورتی بیان کرنے میں انھوں نے کئی بند تحریر کیے ہیں۔ چونکہ اسکے ضمن میں انھوں نے کچھ اہم معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ اس لئے اس قصیدے کی خاص اہمیت ہے۔

رضا علی وحشت نے آزاد کی غزل گوئی کو خوب سراہا ہے اور انتہائی معیاری غزلوں میں شمار کیا ہے۔ آزاد بذات خود کہتے رہے ہیں کہ ان کی غزلوں میں حافظ اور نظیری کا رنگ تغزل جھلکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں ایسی کوئی بات نہیں۔ لطیف الرحمٰن نے ان غزلوں کو کمتر درجے کی شاعری قرار دیا ہے اور یوں ہی سرسری طور پر کہے گئے کلام میں شمار کیا ہے۔ محمود آزاد کی غزلیں جوش بیان کی قوت سے عاری ہیں۔ ان پر تصنع کا گمان ہوتا ہے۔ ایک غزل کا شعر اس طرح ہے۔

ھجوم درد مندان برسر خاک من است امشب

چراغ تربتم از سوز دلھا روشن است امشب

حالانکہ محمود آزاد نے خود کو قصیدہ کو شاعر کی حیثیت سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ تخیلات اور مضمون آفرینی کے میدان میں خاقانی تک دوڑ لگائی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری کے جوہر قصائد اور غزلوں میں نہیں مثنویوں میں کھلتے ہیں۔ آزاد کے نقادوں کی نظر میں مثنوی بحیثیت صنف سخن کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی ہو۔ مگر آزاد نے مثنویوں میں جو لہجہ اختیار کیا ہے، وہ سو فیصدی داخلی ہے۔ اس میں مضمون نگاری کے مصنوعی پہلوؤں کا عمل دخل نہیں ملتا۔

محمود آزاد کی ایک مثنوی " روداد طوفان آفت نشان ڈھاکہ" ۴۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے ایک سمندری طوفان کا ذکر کیا ہے جس کی ہلاکت خیزیوں کی زد میں آکر پورا شہر اور قرب وجوار کے علاقے تباہ وبرباد ہوگئے۔ طوفان کچھ اس قدر طاقتور

تھا کہ بلند اور تناور درخت گھاس کے تنکوں کی طرح ہوا میں اڑ گئے۔ گھر اور جھونپڑیاں لاپتہ ہوگئیں۔ رؤسا کے مکانات اور عمارتیں اینٹوں کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئیں۔ محمود آزاد نے طوفان کی آمد اور اس کی تباہ کاریوں کی ایسی منظر کشی کی ہے جسے پڑھ کر اذیت ناک حالات زندہ جاوید صورت میں سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ واقعات بیان کرنے میں انھوں نے جو تشبیہیں استعمال کی ہیں، وہ نہ صرف دل و دماغ میں اترنے کی قوت رکھتی ہیں بلکہ قاری بھی شاعری کی داخلی کیفیات میں برابر کا شریک ہوجاتا ہے۔ مثنوی کے چند اشعار یوں ہیں:

زمغرب یکی فیل مست سحاب
ز خرطوم آتش فشان جای آب

تا

بسا مردمان و وحوش و طیور
بکشت وبجست و بافگند دور

اور

هوای که کرد از دم فتنه زا
بدریا و ساحل قیامت بپا

تا

فروریخت از صدمه اش ناگهان
نماند ز دیوار و سقفش نشان

محمود آزاد نے اسی مثنوی میں جس خوفناک طوفان کا ذکر کیا ہے، اس کی تاریخی حیثیت ہے اور اسے ۱۹/ویں صدی کی بھیانک تباہ کاریوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ڈھاکہ شہر کی آبادی مختصر تھی۔ سرکاری ریکارڈ میں درج کردہ تفصیلات کے مطابق یہ طوفان ۷/اپریل ۱۸۸۸ء میں آیا۔ ۳۵۲۷ مکانات کے نام ونشان مٹ گئے۔ ۳۰ لاشیں برآمد

ہوئیں۔تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد زخمی ہوئے۔ساحل سمندر پر ۲۱ کشتیاں چکنا چور ہوگئیں۔ محمود آزاد نے اپنی مثنوی میں بھیانک طوفان کا ڈرامائی منظر دل کو چھو لینے والے انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ طوفان سنیچر کے دن آیا تھا۔لگ بھگ سہ پہر کے قریب آسمان اچانک ابر آلود ہوگیا اور شدید بارش ہونے لگی جس کا سلسلہ غروب آفتاب تک جاری رہا۔ اس کے بعد آسمان بالکل صاف ہوگیا۔لیکن تھوڑی دیر بعد انتہائی خوفناک شکل کے سیاہ بادل آسمان پر منڈلانے لگے۔ اس کے بعد وہ تباہ کاریاں ہوئیں جیسے بیان کرنے میں آزاد کا قلم بذات خود چشم گریہ بن گیا۔

مثنوی کے ابتدائی دو اشعار میں آزاد نے طوفان آنے کی تاریخ بھی تحریر کی ہے:

در این روزگار بلا سر گذشت
که بر هیجده هست هشتادوهشت
بتاریخ هفتم ، ز اپریل لے ماه
شده ڈهلکه و اهل ڈهاکه تباه

عبیدی محمود آزاد کی مثنوی نگاری کے فن کو خوب سراہتے تھے۔تقریظ مثنوی ذو البحرین کے عنوان سے انہوں نے آزاد کی مثنوی کی تعریف میں جو قطعہ لکھا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

در دو بحر این مثنوی بنگاشته
بحر معنی اندر او هر سو روان
رشک ارتنگ ست این سردار ...
مانی معنی ست این جادو بیان
سال رنگ آمیزش چون خواستم
از قریحت کوست پیر نکته دان

گفت او از هجرت خیر الوریٰ
حجت فخر آمد این جادو نشان
(۱۲۷۲ھ)

محمود آزاد کی مسدس نگاری بھی کچھ کم نہیں ۔مثنوی کے بعد ان کے دل ودماغ کی جولانیاں مسدس میں نظر آتی ہیں ۔مسدس کا ہر بند مکمل تصویر ہے۔مسدس میں ایسے مضامین لائے گئے ہیں کہ ان پر شاعرفطرت ہونے کا گمان ہوتا ہے ۔ جہاں تک فطری پہلوؤں کا تعلق ہے، اس میں بھی انھوں نے ایک الگ سنجیدہ راہ اختیار کی ہے۔کائنات کا تجزیہ کرنے لگتے ہیں تو کوئی بھی پہلو نہیں چھوڑتے اور انجام دنیا کے دروازے پر لاکر کھڑا کرتے ہیں۔آزاد کو مشاہدہ قدرت میں انسانی زندگی کی مماثلت نظر آئی۔اس لئے وہ بے اختیار کہنے پر مجبور ہیں کہ ہر رنگ کا انجام بیرنگی ہے، ہر خوشی کا اختتام رنج وغم ہے اورشوروغل کا نتیجہ سکوت ہے۔
ان کے مسدس کے چند بند مزاج میں کچھ عجیب طرح حرارت پیدا کرتے ہیں۔

ملاحظہ ہو:

زسبزہ سبزہ سر بسر فضای کوهسار بین
میان سبزہ جابجا شگفتہ لالہ زار بین
پرندہ های گوهرین ز جوش آبشار بین
بہ دوشهای نازک عرائس بهار بین
بہ زیر آبشار ها شگفتہ لالہ زار ها
عجب کہ مشتعل شدہ در آب شرارہ ها
نشستہ در نواگری فراز شاخسار ها
وپاشگفتہ غنچہ ها فراز شاخسار ها
ز ... دستا ربودہ دل ترنم هزار ها

به هر درخت نغمه زن طا یران هزار ها

تا

نه فکر آب ودانه ها نه یاد آشیانه ها

به بزم طبع شورها فگنده از ترانه ها

بنگال کے انیسویں صدی کے فارسی کو شعراء میں محمود آزاد کا مقام سب سے نمایاں ہے۔ انھوں نے ایک فنکار کی سی زندگی بسر کی اور مجلس شعروسخن میں شمع کی طرح روشن رہے۔ سماجی حیثیت سے یوں تو رئیس زادے تھے مگر قدرتی حالات نے تنگ دستی وعسرت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کردیا تھا۔فطری ذہانت ،قوت مشاہدہ اور احساسات نے رنج وغم کی آنچ میں پختگی پائی جوشعروسخن کے میدان میں زبردست قوت اور حرارت بن کر ظاہر ہوئی۔

حوالہ:

ا۔فارسی زبان میں اپریل نہیں بلکہ آوریل درست ہے۔

☆☆☆☆